Dr. Taqdees Zahra

Associate Professor, Jinnah Degree College, Lahore

ڈاکٹر تقدیس زہرا

ایسوسی ایٹ پروفیسر، جناح ڈگری کالج لاہور

واجد علی شاہ کی مرثیہ نگاری

Writing of Elegiac Verse (Marsiya) by Wajid Ali Shah

Abstract: Wajid Ali Shah (Mohammad Wajid) was the last sovereign of Awadh state. He failed in politics & state administration but succeeded in arts and sciences the earned good name in poetry, literature and elegiac verse. He also took interest in buildings and gardens. His genres of conversation are in Urdu and Persian. He has been interest in Music, Buildings. Religion and current History. His literary compositions and writing work pieces are up to 42.

He was a monarch and as well as a writer. He also took interest in Drama and displayed his abilities as a successful artist. These qualities distinguish him from other poets. Wajid Ali Shah was Asna-ashri Shia by faith. So he attended aspecially elegiac Verses. (Marsiya) in religious meetings known as "Majalis" His research work including literary facts are all praise – worthy as he has connected them to his true faith. His effort is ever – longing.

Keywords: Wajid Ali Shah, elegiac Verses (Marsiya), Majalis, Urdu Poetry

ریاست اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ اختر کا اصل نام محمد واجد تھا مگر وہ واجد علی شاہ کے نام سے معروف ہوئے۔ اختر ان کا تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا احمد علی تھا جنھوں نے 1842ء میں اپنی تخت نشینی کے بعد واجد علی شاہ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ لہٰذا والد کی وفات کے بعد واجد علی شاہ 1847ء میں ریاست اودھ کے تخت پر متمکن ہوئے۔(۱) اپنے عرصہ حکومت میں انھوں نے ریاست کے نظم و نسق اور علوم و فنون، ہر شعبے خاص توجہ دی۔ انھیں اودھ کے حالات کچھ مثالی حیثیت میں تو نہ ملے بلکہ نہایت دگرگوں صورت میں تفویض ہوئے۔ وہ اپنی ولی عہدی کے زمانے ہی سے ان تمام معاملات کو دیکھتے اور پرکھتے آئے تھے اور اب بادشاہ کی حیثیت سے ان کی بھرپور کوشش تھی کہ وہ ان معاملات کو سنوارنے کی طرف لے جائیں۔ ذاتی حوالے سے:

> وہ نہایت وجیہہ، خوبصورت اور جامہ زیب تھے۔ ذہانت و زکاوت اور حافظہ قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ شاعری کا ذوق پیدائشی تھا۔ حد درجہ موزوں طبع تھے۔ جدت طرازی ان کی فطرت کا خاصہ تھی۔ شعر کہتے تو کہتے چلے جاتے۔ علوم متداولہ بڑے شوق سے اور جلد حاصل کیے۔(۲)

جس زمانے میں واجد علی شاہ کو حکومت ملی اس وقت لکھنوی معاشرہ باوجود تموّل کے تنزّل کا شکار تھا۔ معاشرے میں تہذیب اور تعلیم کے ساتھ ایک خاص طرح کا تکلف، تصنع اور بگاڑ تھا جس نے لوگوں کی زندگی میں راہ بنالی تھی۔ اس مصنوعی پن نے اس عہد کے لکھنو کو بے حد متاثر کیا اور معاشرے

کو کھوکھلا کر دیا۔ اس بگاڑ کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ریاست اودھ میں حکومتی امور کو چلانے کے لیے انگریز ریزیڈنٹ مقرر تھا اور تسلسل کے ساتھ یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ جوں ہی کوئی نواب اس دارِ فانی سے کوچ کرتا تو انگریز فوری طور پر دوسرے نواب کو تخت پر بٹھا دیتے اور قرض کے طور پر خطیر رقم نواب کو تھما دیتے کہ وہ ان سے نظام چلائے۔ اس رقم یا قرض کے عوض انگریز ریاست اودھ کا کوئی علاقہ ایسے اپنے قبضے میں کر لیتے نیز بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ وہ سیر و تفریح پر مشغول رہے اور حکومتی امور کے لیے پریشان نہ ہو۔

نواب شجاالدولہ کی وفات کے بعد واجد علی شاہ کی تخت نشینی تک یہی معمول رہا اور جو ریاست انھیں ورثے میں ملی اس پر حکومت کے لیے انھوں نے اپنے انداز سے خوب محنت کی۔ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اعلیٰ منتظم اور اچھے حکمران ہونے کا ثبوت دیں اور اودھ کی اس ڈوبتی نیّا کو بچا لیں۔ تاہم وہ سیاسی اور انتظامی حوالے سے تو ناکام رہے البتہ علوم و فنون، ادب اور شاعری کے حوالے سے کامیاب رہے۔ انھیں شاعری، موسیقی، فن تعمیر اور دیگر فنون سے خاص شغف تھا۔ لکھنؤ کے اس تباہ شدہ معاشرے میں بھی علوم و فنون میں اپنی مہارت اور کمالات دکھانے کا انھیں بھرپور موقع ملا۔ بقول عبدالحلیم شرر:

> دنیا میں عمارت کے شوقین ہزاروں بادشاہ گزرے ہیں مگر غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتیں اور باغ نہ بنوائے ہوں گے جتنے کہ واجد علی شاہ نے اپنی ناکام زندگی اور برائے نام شاہی کے مختصر زمانے میں بنائے۔ (۳)

اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ واجد علی شاہ نے اودھ میں نہ صرف اپنی حکومت کے دوران میں تو بہت سی خوبصورت عمارات، محل اور باغ بنوائے بلکہ انھوں نے مٹیا برج کلکتہ میں اپنی نظر بندی کے زمانے میں بھی بہت سی تعمیرات کروائیں اور محل اور باغ بنوائے۔

واجد علی شاہ کو دوسرا شوق ادب اور شاعری کے حوالے سے تھا۔ وہ کثیر التصانیف شخصیت تھے۔ انھوں نے مثنوی، غزل، قصیدے، رباعیات کے تحت سلام اور مرثیے جیسی اہم اصناف میں طبع آزمائی کی۔ یہ تصانیف اردو اور فارسی زبانوں میں ہیں۔ انھوں نے علمِ عروض پر ایک رسالہ لکھا نیز موسیقی، خطوط نویسی، پند و نصائح، مذہب اور تاریخ جیسے موضوعات پر بھی بہت لکھا۔ بقول عبدالحلیم شرر، واجد علی شاہ کو موسیقی، تعمیرات اور تصانیف کا حد درجہ شوق تھا۔ (۴) اگر ان کی تعمیر کردہ تعمیرات میں حضرت باغ، سکندر باغ اور قیصر باغ مشہور ہیں تو ان کی تصانیف میں "حزنِ اختری" اور "بنی" بہت معروف ہیں۔ ان میں اوّل الذکر ان کی منظوم سوانح ہے جبکہ مؤخر الذکر منثور سوانح کی زیل میں آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی خود واجد علی شاہ نے اپنی کتابوں کے نام الف بائی ترتیب سے "بنی" میں درج کیے ہیں۔ (۵) ان تصانیف کی فہرستیں مختلف اور لوگوں نے بھی تیار کی ہیں جیسے کہ کوکب قدر، سجاد علی، مرزا مسعود حسن رضوی ادیب وغیرہ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اردو" کی جلد سوم میں واجد علی شاہ کی جن کتابوں کے نام درج کیے ہیں وہ انھی احباب کی تیار کردہ فہرستوں کی مدد سے ترتیب دیے ہیں اور ان کی تحقیق کے مطابق واجد علی شاہ کی تصانیف تعداد میں بیالیس (۴۲) ہیں:

> ہندوستان کی تاریخ میں اس رنگ و وضع کا کوئی دوسرا بادشاہ شاید ہی ایسا گزرا ہو جس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے نئے رجحانات کو جنم دیا۔ علم و ادب میں خود شریک ہو کر اس کی سرپرستی کی اور فنونِ لطیفہ میں اپنی ایجادات و اختراعات سے نئے میلانات کو ابھارا۔ واجد علی شاہ کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے

جس کا پل پل ان کی تصانیف سے نمایاں ہوتا ہے اور ان کی پوری شخصیت کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔(۶)

واجد علی شاہ فطری طور پر شاعر اور فنکار تھے۔ وہ نہایت زود گو شاعر واقع ہوئے تھے اور علم و ادب کی سرپرستی میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کے تخلیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے اور بقول جمیل جالبی کے انھوں نے نہ صرف اپنے دور کو متاثر کیا بلکہ اس سے متاثر بھی ہوئے۔ اپنی شخصیت اور کارناموں کی وجہ سے وہ اودھ کی تہذیب کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ لکھنوی تہذیب، رکھ رکھاؤ، علم دوستی، فن پرستی اور شاعری ان کی ذات کا حصہ تھے:

واجد علی شاہ کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے تھا۔ ان کی استعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ 18 سال ہی کے سن میں دو دیوان اور تیس مثنویوں کے مصنف تھے۔(۷)

اس زود گوئی اور ہر فن مولا قسم کی حیثیت نے ان سے بیشتر تخلیقی کام کروائے۔ فن تعمیر، موسیقی اور شاعری کے ساتھ ساتھ انھیں ڈراما نویسی کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے غزل، مثنوی اور ڈراما تینوں اصناف میں بھرپور تخلیقی جوہر دکھائے اور اسی ڈراما نویسی اور فنکاری کے شوق کے نے ان سے "رہس" کی تخلیق کروائی۔ ناٹک "رہس" میں یہی دلچسپی انھیں دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

دراصل واجد علی شاہ کی ہر سالگرہ پر ان کی والدہ انھیں جوتشیوں کے مشورے پر جوگی بناتی تھی اور محل میں ایک بڑا جلسہ، محفل رقص و طرب کے نام سے منعقد ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ نے کسی ایسے ہی جلسے میں رادھا اور کرشن کی کہانی کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے کا سوچا سالگرہ کا جلسہ "رہس" کہلاتا تھا اور اس میں ولی عہد جوگی بنتے اور خادمائیں پریاں یا جوگنیں بنتیں۔ اسی نسبت سے ایک جلسے میں واجد علی شاہ نے خود کرشن کا روپ دھارا اور خادمائیں گوپیاں بنیں۔ انھوں نے اس "رہس" میں رقص اور ڈراما دونوں صورتیں شامل کیں یعنی ناچ اور ناٹک (شاید رہس کا لفظ راس لیلا سے ماخوذ ہے یعنی رام لیلا یا کرشن لیلا جس میں رام یا کرشن کی زندگی کے واقعات کو منظوم رقص اور ڈرامے کی صورت میں بیان کیا جاتا تھا) واجد علی شاہ اپنے عہد کے رہس کی تمام تفصیلات اور اہمیت "بنی" میں بیان کر چکے ہیں۔ اس حوالے سے رئیس احمد جعفری کا کہنا ہے کہ

واجد علی شاہ بڑے صاف گو تھے جو دل میں وہ زبان پر۔۔۔ انھوں نے اپنی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں چھپایا۔ اچھا یا برا، سیاہ یا سفید، روشن یا تاریک جو کچھ دیکھا، جو کچھ دل میں خیال آیا اس تک کو بغیر کسی جھجک اور تامل کے بیان کر دیا۔(۸)

مذکورہ بالا تمام باتوں سے ان کی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور ان سب کا تعلق ان کی زندگی کے مختلف جذباتی امور سے تھا لیکن ان کی زندگی کا ایک اور اہم رخ ان کے مذہب یا مسلک سے وابستہ تھا چونکہ لکھنوی نواب عقیدے کے لحاظ سے اثنا عشری شیعہ تھے لہٰذا مذہبی روایات کو بہت اہتمام سے انجام دیتے تھے۔ ان مذہبی رسومات میں محرم الحرام کی مجالس اور عزاداری کی روایت سب سے بڑھ کے تھی۔ محرم کی مجالس میں مرثیہ خاص طور پر پڑھا جاتا تھا۔ لہٰذا واجد علی شاہ نے اپنے عقیدے کی مناسبت سے مرثیہ نگاری پر خصوصی توجہ دی۔ اگر دیکھا جائے تو یہ پہلو ان کی شخصیت کی ظاہری حیثیت سے بالکل جدا ہے لیکن لکھنوی معاشرت کی رعایت سے یہ اس کا ایک لازمی عنصر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ واجد علی شاہ نے بہت سے مرثیے کہے۔ یہ مرثیے ایک طرف تو ان کی عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کا مقصد حصول ثواب تھا:

واجد علی شاہ کی شعر گوئی کی جو ابتدا عہدِ محمد علی شاہ میں ہوئی تھی اس کی انتہا ان کی مدت اسیری میں ہوئی۔ اصنافِ شاعری میں غزل ہو یا قصیدہ، مثنوی ہو یا مخمس، نظم ہو یا رباعی، قطعہ ہو یا سلام، نوحہ ہو یا مرثیہ تمام اصنافِ سخن میں معنوی خوبی کے ساتھ بلند تخیل کے سمندر موج زن ہیں۔(۹)

اپنے تمام مراثی کو انھوں نے یکجا کر کے "توشہ آخرت" کے نام سے چھپوایا اور بعد ازاں اس کا انتخاب "ریاض العقبیٰ" کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ مرثیے تعداد میں انہتر (۶۹) ہیں:

ہفتاد ایک کم تھے مراثی جدا جدا
ان سب کو جمع محنتوں سے ایک جگہ کیا
تو شہ آخرت کا یہ نام اب دھرا بھی ہے
سن بارہ سو اٹھانوے میں یہ لکھا بھی ہے(۱۰)

ڈاکٹر سید منظر حسین کاظمی نے واجد علی شاہ کے مراثی پر مشتمل گیارہ مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں: توشہء آخرت، دفتر غم اور بحر الم، ریاض القلوب، ریاض العقبی، دفتر پریشان، مقتل معتبر، مجموعہ مراثی حصہ اول، مجموعہ مراثی حصہ دوم، مِلکِ اختر، سرمایہ ایمان۔

ان کے علاوہ انھوں نے محرم کی مجالس میں پڑھنے کے لیے دس دس مرثیوں کے کئی مجموعے بھی ترتیب دے رکھے تھے۔ ان میں ظاہر ہے تکرار بھی ہو گی تاہم "توشہ آخرت" میں شامل مرثیے تعداد میں انہتر ہیں اور یہی ان کے کل مرثیے ہیں۔ یہ سب مراثی چہار دہ معصومین اور شہدائے کربلا سے متعلق ہیں۔ مراثی کی یہ تعداد اس میدان میں ان کے فکری و فنی مرتبے کو متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کے یقیناً اور بھی مراثی ہوں گے جو زمانے کی گردش میں محفوظ نہ رکھ سکے تاہم جو سرمایہ ہم تک پہنچا ہے، وہ بھی ان کی پہچان کے لیے کافی ہے۔

ہمیں علم ہو چکا کہ مرثیہ واجد علی شاہ کے اظہارِ فن اور حصولِ ثواب کی نیت پر مبنی تھا اور یہ مذہبی شاعری ہے جس میں واقعہء کربلا اہم موضوع ہوتا ہے۔ اس مناسبت سے مرثیہ کہنا، پڑھنا اور سننا سب کچھ ثواب کی ذیل میں آتا ہے۔ واجد علی شاہ نے ایک طرف مختلف موضوعات پر مرثیے کہے یعنی صرف واقعہ کربلا کے بیان تک محدود نہ رہے اور دوسری طرف شیعہ کتب کی دیگر روایات کو بھی اپنے مراثی کا موضوع بنایا۔ اس حوالے سے تاریخی روایات کا بیان اور ترتیب اخلاق ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نسبت سے واجد علی شاہ کے مرثیوں کا انداز روایتی نہیں بلکہ نہایت منفرد ہے۔ مثلاً:

1۔ باغِ جہاں میں طائرِ بسمل ہیں مرتضیٰ
2۔ سر مشکل کشا نے ذائقہ تلوار سے پایا
3۔ وابستہ ہے خدائی امام رضا کے ساتھ
4۔ علی نقی جو امام دہم ہیں بدر کمال
5۔ محشور کر مجھے حسن عسکری کے ساتھ
6۔ مسلم کے پسر ضیغم اندوہ و بلا ہیں

یہ چاند ایک ایسے مرثیے ہیں جن کے مطلع ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کربلا کے بیان پر مبنی نہیں۔ واجد علی شاہ کے مرثیوں میں ایک انفرادی رنگ یہ بھی ہے کہ وہ غم کا اظہار کرتے ہوئے بھی راگ راگنیوں کا ذکر کرتے ہیں، ان کے اثرات بھی بیان کرتے ہیں، اس سے ان کے ذوقِ موسیقی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس نسبت سے واجد علی شاہ نے ایک مرثیہ مثنوی کی طرز پر لکھا ہے اور بقول ڈاکٹر سید منظر حسین کاظمی آج بھی بہت مقبول ہے:

عجب غم کی اندھی نے گھیرا ہے مجھ کو
اگر رات بھی ہو سویرا ہے مجھ کو(۱۱)

واجد علی شاہ نے مرثیوں میں روایتی انداز کو بھی اپنے منفرد لہجے میں برتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ رجز اور گھوڑے یا تلوار کی تعریف میں بھی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کا ایک مرثیہ ہے: (کیوں چرخ کے چہرے پہ گھٹا چھائی ہے غم کی) اس میں وہ حضرت علی اکبرؑ کی میدانِ جنگ میں آمد کا حال بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

میں وہ ہوں جو ابنِ خلف شیر خدا ہوں
دادا ہے میرا فخر عرب شکل ہما ہوں
دادی ہے بتولِ مدنی لطف ہُدی ہوں
نانا ہے رسولِ عربی تنگ قبا ہوں

عمّو حسنِ سبز قبا ، ماں ملکہ ہے
ہُرمُز کے جگر بند سے یہ نور اُگا ہے

دادا نے ہمارے در خیبر کو اکھاڑا
پل تختہ بنا پَٹ گیا خندق کا کڑاڑا
نیزہ بہ سرِ سنگ ، جہاں دار نے گاڑا
دو فرقِ عمرو کر دیا مرحب کو لتاڑا

باتیں دہنِ خود سے سنیں شمسِ جہاں نے
تحسین کے الفاظ کہے کون و مکاں نے (۱۲)

واجد علی شاہ کے مرثیوں میں تاریخی شعور بھی نظر آتا ہے مگر وہ تاریخ کے ذکر سے اشعار کو بوجھل نہیں کرتے بلکہ تاریخی حوالوں کا ذکر نہایت برمحل ہے۔ کہیں کہیں مرثیے میں تاریخ کے بیان کو انھوں نے قدرے مرصع کر دیا ہے اور الفاظ وواقعات کی وضاحت کے لیے لغت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرثیے میں انھوں نے حضرت علیؑ کے ان ناموں کو یکجا کر دیا ہے جو دیگر مذہبی کتب میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ جیسے: ایلیا، ارماشنطیا، الجا، ذالعلا، ملیلا، بت شکن، فیروز کعبہ، بوتراب (۱۳) اسی طرح ایک اور مرثیے میں اسمِ محمدؐ کے حروف کی تشریح کی ہے اور یہ کام کسی عام شاعر کے بس کا نہیں۔

ہیں "میم" محمد سے بہت رمز نمایاں

اس مرثیے میں ختمی مرتبتؐ کے پینتالیس منفرد ناموں کا ذکر نہایت وضاحت سے درج کیا ہے جیسے ملاحم، مقفا، قثم، مؤد، فارقلیط، حاشر ماحی ن (۱۴) ان کے ایک اور مرثیے میں ایسے پیغمبروں کے نام بھی درج ہیں جن سے عام طور پر لوگ واقف نہیں مثلاً حزقیل، ذالکفل، شعیا حیقوق، ارمیا/یرمیاہ، جرجیس وغیرہ (۱۵)

ان میں سے البتہ ایک نبی کا نام قران پاک میں جبکہ دو پیغمبروں کے نام بائبل میں موجود ہیں۔

واجد علی شاہ کے مرثیوں سے نہ صرف ان کی علمی قابلیت اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان کی جذباتی کیفیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور اپنے احساسات کو عقیدے کے ساتھ ملا دیتے ہیں اور اس طرح ان کے جذبوں کی سچائی بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان کے مراثی واقعات، حقائق اور تاریخی بیانات کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی زندگی کی المناک فضا کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں انسانی رشتے اور جذب نہایت وضاحت اور شدت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے کردار نگاری ان کے مرثیوں کی خاص پہچان بن کر ابھرتی ہے۔

واجد علی شاہ نے مرثیے کے روایتی کرداروں کو اپنے اندازِ بیان سے زندگی بخشی ہے۔ وہ کردار نگاری کو نفاست اور سچائی کے پیرائے میں ابھارتے ہیں۔ مرثیے کے یہ روایتی کردار امام حسینؑ، بی بی زینب، حضرت عباسؑ، علی اکبرؑ، علی اصغرؑ، حرؑ، شہزادہ قاسمؑ، بی بی سکینہؑ اور بی بی ام کلثومؑ ہیں۔ یہ تمام شخصیات تاریخی اور مذہبی اہمیت رکھتی ہیں اور واجد علی شاہ نے ان سب کی تصویر کشی میں عقیدت اور حفظ مراتب کا بخوبی خیال رکھا ہے۔ نیز ان کے افکار کی مدد سے انھوں نے زندگی کے فلسفے اور واقعہء کربلا کی اہمیت کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ انھوں نے ان کرداروں کو ان کے ماحول، پس منظر اور ان کی شخصی خوبیوں کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اس حوالے سے مرثیوں میں ان کی کردار نگاری قابل ستائش ہے۔

واجد علی شاہ کے مرثیوں کا اندازِ بیان خاص لکھنوی انداز کا ہے جس میں عالمانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ نفاست، نزاکت اور لطافت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی جدتِ طبع کی بدولت مرثیوں کے لیے مسدس کے علاوہ مخمس، مثنوی، ترکیب بند اور ترجیع بند کی ہیئتوں کو بھی استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فنی پختگی سے کام لیتے ہوئے اپنے مراثی میں لفظی و معنوی خوبیاں یکجا کر دی ہیں۔ اس حوالے سے بیان و بدیع کے ساتھ ساتھ ان کے مرثیوں کی نمایاں پہچان سلاست، روانی اور فصاحت بھی ہے۔ وہ لفظوں کی صحت اور بندش کا خاص خیال رکھتے ہیں اور مرثیوں کو عام فہم بھی بناتے ہیں۔ مثال دیکھیے:

بیٹے کا غم پدر کے کلیجے سے پوچھیے — اور چاشنی مرگ کو جینے سے پوچھیے

غم باپ کے گزرنے کا بیٹے سے پوچھیے — بینائی کا مزا کسی اندھے سے پوچھیے

دیکھو یہاں عصائے ضعیفی بھی چھُٹ گیا
اکبر کے غم میں شاہ کا جی رو کے گھٹ گیا(۱۶)

واجد علی شاہ نے اپنے مرثیوں میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار، اخلاقی اور سماجی جذبات نگاری کو بھی جگہ دی ہے گو کہ حصولِ ثواب کی نیت سے لکھے جانے والے ان کے مرثیوں میں بُکا اور دُعا کے عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ بکائیہ اور دعایہ عناصر حقیقت سے تجاوز کرتے نظر نہیں آتے۔ واجد علی شاہ نے میر انیس، مرزا دبیر، شاد عظیم آبادی اور پیارے صاحب رشید جیسے قد آور مرثیہ نگاروں کے درمیان اپنا قد بلند کیا ہے۔ ان کی جدت طبع ان کے تمام مراثی میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ ایک محتاط مرثیہ گو ہیں اور ان کی مرثیہ نگاری اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ داستان گو سے زیادہ ہمیں مورخ نظر آتے ہیں۔

واجد علی شاہ واقعاتِ کربلا میں اپنے تخیلاتی قصے شامل نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مرثیہ نگاروں میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کے مرثیوں کا موضوع ختمی مرتبت محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے گرد گھومتا ہے۔ لہٰذا وہ حدود سے تجاوز نہیں کرتے اور اہلِ بیت اپنے عشق کو عقیدت ہی کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے خود کو محض واقعہ کربلا ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ خاندان رسالت کے چہاردہ چراغوں اور پاکیزہ کرداروں کے ذکر سے اپنے قلم کو جلا اور بیان کو ندرت بخشی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶ء، ص ۹۵۶۔۹۵۷

۲۔ ایضاً۔ ص ۹۵۷

۳۔ عبدالحلیم شرر۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (گزشتہ لکھنؤ)۔ کراچی: غضنفر اکیڈمی، س ن۔ ص ۷۶

۴۔ ایضاً۔ ص ۷۵

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ ص ۹۶۲

۶۔ ایضاً۔ ص ۹۶۲

۷۔ ڈاکٹر سیّد منظر حسین کاظمی۔ واجد علی شاہ، ان کی شاعری اور مرثیے۔ کراچی: شیخ شوکت علی اینڈ سنز، ۱۹۹۲، ص ۷۵

۸۔ رئیس احمد جعفری۔ واجد علی شاہ اور ان کا عہد۔ لکھنؤ: یونائیٹڈ انڈیا پریس، س ن۔ ص ۱۷

۹۔ ڈاکٹر سیّد منظر حسین کاظمی۔ واجد علی شاہ، ان کی شاعری اور مرثیے۔ ص ۸۰

۱۰۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم۔ ص ۹۸۶

۱۱۔ ڈاکٹر سیّد منظر حسین کاظمی۔ واجد علی شاہ، ان کی شاعری اور مرثیے۔ ص ۱۲۶

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۱۲۷

۱۳۔ ایضاً۔ ص ۱۳۰

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۱۳۲

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۱۳۵

۱۶۔ ایضاً۔ ص ۱۴۶۔۱۴۷